سماجی تشکیل نو کا تصور اور لائحہ عمل، اسوۂ حسنہ کے تناظر میں ایک جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن *

Abstract:

The process of social restructuring and collective change is a continual masterstroke. Many revolutionary exercises were made in this regard but any revolution did not achieve global status and comprehensiveness like the social change created by the Holy Prophet (SAW). In this context it is need of the hour to specify the steps of social restructuring like concept and vision of social change, whereabouts of this change, analyses of the society in which social restructuring is aimed, importance of sociological discipline, signification of required training, magnitude of leadership, specification of suitable methods for social restructuring and features of counter resistance policy. In this article these topics/points highlighted with reference of role model of the Holy Prophet (SAW).

انسانی معاشرہ میں اجتماعی تبدیلی اور سماجی تشکیل نو کا عمل ایک صبر آزما جہد مسلسل کا نام ہے۔اس سلسلے میں دنیا کے اندر یوں تو کئی ایک انقلابی کاوشیں ہوئی ہیں لیکن جو عالمگیریت اور ہمہ گیریت رسول ﷺ کی برپا کردہ اجتماعی تبدیلی کو حاصل ہوئی ہے وہ آج تک کسی اور انقلاب کو حاصل نہیں ہوسکی۔لہٰذا سیرت نبویؐ کا اس حوالہ سے مطالعہ کیا جانا وقت کی ضرورت ہے تاکہ اسوۂ حسنہ کی روشنی میں سماجی تشکیل نو کے خطوط کا تعین کیا جاسکے۔چنانچہ سماجی تشکیل نو اور اجتماعی تبدیلی کے لئے درج ذیل بنیادی اور اساسی امور کا تعین ضروری ہے۔

1۔ سماجی تشکیل نو کا تصور اور وژن

2۔ سماجی تشکیل نو کا دائرہ کار

3۔ جس معاشرہ میں تبدیلی لانا مقصود ہے اس کا تجزیہ

4۔ سماجی تشکیل نو کے لئے اجتماعی نظم کی اہمیت

5۔ سماجی اجتماعیت کے لئے تربیت کی ضرورت

6۔ سماجی تشکیل نو کے لئے قیادت کی ناگزیریت

7۔ سماجی تشکیل نو کے لئے موزوں طریقہ کار کا تعین

* چیئرمین، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

8۔ مزاحمت کی جوابی حکمت عملی کے خدوخال

آمدہ سطور میں ان نکات کا ایک جائزہ پیش ہے۔

1۔ سماجی تشکیل نو کا تصوراور وژن:

سماجی تشکیل نو کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے سامنے اس نظام کا وژن پیش کیا جائے جو موجود مسائل کا بہترین حل ہو۔ کوئی بھی تبدیلی خواہ محدود پیمانہ پر ہو یا وسیع پیمانہ پر، اس کی بنیاد جب تک ایسا عقیدہ اور نظریہ نہ ہو جس پر سماجی تبدیلی اور ہمہ گیر اصلاح کی علمبردار قوت یقین رکھے، اس کے مطابق عمل کرے، اس کے لئے قربانی دے اور اس کے تقاضوں کی پابندی کرے اس وقت تک وہ تبدیلی بے مقصد اور بے سود قرار پائے گی۔ متبادل حل کے بغیر موجود نظام پر محض تنقید نا کافی ہے، چنانچہ اسلام نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو محیط ایک جامع تصور دیا ہے جو خدا اور بندے کے تعلقات یعنی عقائد وعبادات کے علاوہ بندوں کے باہمی تعلقات یعنی معاملات کی کیفیات کی وضاحت کرتا ہے۔ عقائد وعبادات کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان کے علاوہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے فرائض آ جاتے ہیں جب کہ معاملات کے ضمن میں دنیوی زندگی کے تمام پہلو بشمول سیاسی، معاشی اور سماجی شعبہ جات زیر بحث آتے ہیں اور اسلام کے اس جامع تصور حیات کا سرنامہ کلمہ طیبہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار قریش کے سردار آپ کے چچا ابوطالب کے ہاں جمع ہوئے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف اور ابوسفیان بن حرب جیسے لیڈر شامل تھے۔ ابوطالب کی معرفت ان لوگوں نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''میں صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع فرمان ہوگا''۔ گویا توحید کا کلمہ بظاہر صرف ایک اعتقادی کلمہ ہے مگر اس کے اندر ہر قسم کی انسانی فتوحات کا راز چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت کی آواز اور زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلی کا عنوان ہے۔(1)

اسلام کی تعلیم میں توحید، خدا کے سامنے حاضر ہونے کا یقین، ہمہ گیر سماجی عدل وانصاف اور تہذیب نفس کے جامع اور ہمہ گیر اصول موجود ہیں۔ چنانچہ وہ خدا پرستی کو انسانیت کا ایک لازمی جز ٹھہراتا ہے لیکن اس کے لئے کسی پروہت طبقے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ معاشیات کی عادلانہ تقسیم کا علمبردار ہے جس کی رو سے انسان کی طبعی

ضرورتوں خوراک، لباس، مکان، تعلیم اور صحت کے انتظامات تمام انسانوں کے لئے یکساں ہوں۔غرض جہاں وہ خدا کو پہچاننے اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے مواقع ہر انسان کو بہم پہنچاتا ہے وہاں ہر ایک انسان کی طبعی حیوانی ضروریات فراہم کرنا تمام انسانوں کا فرض قرار دیتا ہے اور اسے خدا کی محبت کا ایک جزو بناتا ہے۔اسی بناء پر جو شخص خدا کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرتا ہے لیکن اس کی محبت کا دم بھرنے کے بعد اس کے بندوں کے ساتھ انصاف کرنے اور کمزور انسانوں کی مدد کرنے میں سستی، کاہلی، غفلت یا بے رخی دکھاتا ہے، وہ اسلام کی نگاہ میں مجرم اور خدا کے سامنے گنہگار ہے، اس سے دنیا میں قرآنی معاشرہ اور نظام جواب طلب کرے گا اور مرنے کے بعد کی زندگی میں خدا تعالیٰ خود ایک دن مقرر کر کے جواب طلبی کرے گا۔بعض نام نہاد مذہبی لوگ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے مسائل کو تو دین قرار دیتے ہیں لیکن حکومت اور اس سے متعلقہ امور جیسے ٹیکس وصول کرنا، فوجداری اور دیوانی انتظام کرنا، مخالفین کے ساتھ جنگ یا صلح کرنا اور معاہدے کرنا وغیرہ کو سیاست اور دنیا قرار دے کر اس سے احتراز کا مشورہ دیتے ہیں حالانکہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا بیشتر حصہ عباداتی فرائض ادا کرنے کے بعد قرآن کی اشاعت، بیرونی وفود سے ملاقاتوں، حکمرانوں کو دعوت اسلام، مقدمات کے فیصلوں، لشکروں کی تیاری، جو حکمراں آپ کی دعوت قبول نہیں کرتے اور اپنی رعایا پر ظلم کرتے ان پر لشکر کشی، نظام مملکت کے لئے مالیانے کی جمع، تعلیم کے انتظام، غریبوں اور بے کسوں کی خبر گیری اور ان کے قرضوں کے ادا کرنے کے انتظام نیز یتیموں کی جائیداد کے اہتمام اور بیواؤں کی نگرانی کرنے میں گزرتا تھا۔ (2)

2۔ سماجی تشکیل نو کا دائرہ کار:

رسول اکرم ﷺ کی دعوت خاص قبیلہ، نامزد خاندان یا مخصوص حلقہ تک محدود نہیں تھی جیسا کہ گذشتہ انبیاء کی دعوت تھی۔اس لئے آپ کی انقلابی تحریک کا حلقہ عمل محض جزیرہ نما عرب نہیں تھا بلکہ یہ انقلاب حقیقت میں بین الاقوامی تھا، گو اپنے طریق کار میں ابتداءً قومی تھا، یہی سبب ہے کہ مشرق و مغرب کی طاقتوں یعنی ایران و روم کو قرآنی نظام کے تحت لا کر اس تحریک کو عالمی حیثیت دی گئی۔واضح رہے کہ قیصر و کسریٰ کے نظام دنیاء انسانیت کے لئے تباہ کن تھے۔ان نظاموں نے متمدن انسانیت کے اکثریتی حصہ کو اس انداز میں اقتصادی اور ذہنی غلامی میں جکڑ رکھا تھا کہ کسی انسان کو اپنی حقیقی اور روحانی ضرورتوں پر غور و فکر کا وقت نہیں ملتا تھا لہٰذا مشرق و مغرب کے ان مراکز میں انقلاب برپا کر کے انسانیت کو آزاد کرانا ضروری تھا۔

چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کے ذریعے دنیائے انسانیت میں جو انقلاب برپا کیا وہ حقیقی معنوں

میں عالمگیر اور ہمہ گیر تھا۔اس پر درج ذیل آیات قرآنی شاہد ہیں۔

وارسلناک للناس رسولا و کفی باللہ شھیدا (3)

(ہم نے آپ کو تمام انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجا اور اس پر اللہ بطور گواہ کافی ہے۔)

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (4)

(ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔)

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا ولکن اکثرالناس لا یعلمون(5)

(ہم نے آپ کو تمام تر انسانیت کے لئے بشارت دہندہ اور خبر دار کنندہ بنا کر بھیجا لیکن اکثر لوگ اس سے لاعلم ہیں۔)

رسول کریم ﷺ نے اسی عالمی تناظر میں قومی نظام کے استحکام کے بعد فارس، روم، یمن، مصر، حبشہ، بحرین، دمشق، عمان اور یمامہ کے حکمرانوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے مختلف وفود بھیجے اور خطوط ارسال کئے۔

آپ نے براہ راست اور اپنی تربیت یافتہ جماعت کے ذریعہ مہذب اقوام کی اکثریت کو توحید اور خدمت انسانیت کے نکات پر جمع کر کے نہ صرف یہ کہ ان کے تعلقات ان کے خالق کے ساتھ درست نہج پر قائم کر دیئے بلکہ ان کے باہمی تعلقات بھی عدل پر استوار کر دیئے۔اب جب کوئی اجتماعیت ہمہ گیر سماجی تشکیل نو کے لئے کوشاں ہوگی تو اسے آپ کے نقش قدم پر ہی چلنا ہوگا۔جو گروہ اس لائحہ عمل کے برعکس پروگرام ترتیب دے گا وہ تو سرے سے ناکام رہے گا یا صرف جزوی طور پر کامیاب ہوگا اور جو معاشرہ اپنی زندگی، اسلام کے اس جامع نظام کے تحت بسر کرے گا، اس کے لئے دنیا میں غلبہ کا دوٹوک وعدہ اور آخرت میں جنت کی ضمانت ہے(6) اسی بنا پر بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کی حقیقی اور انقلابی سوچ کو معاشرہ میں رواں دواں رکھنے کے لئے باشعور اور خدا پرست مجتہدین کی اجتماعیت کا وجود فرض کفایہ (اجتماعی فرض) کی حیثیت رکھتا ہے۔(7)

3۔ معاشرہ کا تجزیاتی مطالعہ:

اجتماعی تبدیلی، محض نصب العین کی سچائی پر ہی منحصر نہیں ہوتی بلکہ معاشرے کی صلاحیت پر بھی موقوف ہوتی ہے۔چنانچہ عرب کے جغرافیہ میں جو انسانی عنصر جمع تھا وہ اس لحاظ سے انتہائی خوش قسمت تھا اس کی ظاہری جہالت

اور اکھڑ پن کے پیچھے فطرت کی سادگی پوری طرح محفوظ تھی، تیس لاکھ کلومیٹر رقبہ والا گرم ملک بعض اعلیٰ ترین انسانی اقدار اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ایک عرب اپنے اونٹ کو جو اس کی معاش کا واحد ذریعہ تھا، ذبح کر کے اس کا گوشت مہمانوں کو کھلا دیا کرتا تھا تا کہ وہ بھوکے نہ رہیں، اگر کوئی مظلوم شخص جنگل میں کسی عرب کے خیمے میں پناہ لیتا تو وہ ہاتھ میں تلوار لے کر اس کی حفاظت کرتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنی جان پر بھی کھیل جاتا تھا حتیٰ کہ اگر ڈاکو کسی قبیلہ کی خواتین کے قیمتی لباس اور زیورات لوٹنا چاہتے تو وہ ان کو چھو تک نہیں سکتے تھے، وہ عورتوں سے صرف یہ کہتے تھے کہ وہ ازخود زیورات اور لباس حوالہ کر دیں اور جس وقت عورتیں لباس اتار رہی ہوتیں، ڈاکو اپنے چہرے پھیر لیتے تا کہ ان کی نگاہ عورتوں کی برہنگی پر نہ پڑے۔

عرب بادیہ بالکل سیدھے سادھے یا کم فہم لوگ نہیں تھے بلکہ وہ نہایت باشعور تھے اور بہت جلد باتوں کی تہہ تک پہنچ جاتے، ان کے ہاں کہنے اور کرنے میں فرق کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ اقرار اور انکار کے درمیان کسی تیسری چیز کو نہیں جانتے تھے۔ جب وہ کسی کو ایک قول دے دیتے تو اس کو ہر حال میں پورا کرتے، خواہ اس کی خاطر جان و مال کی کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ (8) اس کے علاوہ بھی ان میں کئی ایک ایسی خوبیاں تھیں جو عرب کے کسی اور قبیلہ میں نہیں پائی جاتی تھیں مثلاً مردانگی، راست گوئی، بہادری، ایثار، حرمت والی چیزوں کی حفاظت، ہمسایہ کے حقوق کا تحفظ، بردباری اور صبر واستقامت وغیرہ اور ساتھ ہی ان میں کچھ ایسی مہلک برائیاں بھی رائج تھیں جن پر عربوں کو فخر تھا اور ان کے نہ ہونے کو عار سمجھتے تھے جیسے شراب نوشی، جوابازی، ظلم پیشہ رشتہ داروں سے تعاون، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا، باندیوں کو کمائی کی خاطر بدکاری پر مجبور کرنا، جہالت اور نسلی وطبقاتی تکبر وتعصب وغیرہ۔

اس تجزیہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ تبدیلی کے عمل اور سماجی اصلاح کے لئے ایسے افراد کے ذریعہ سماجی تشکیل نو کے عمل کا آغاز کیا جائے جن میں کم از کم راست گوئی، بہادری، صبر، ایثار اور عقلمندی کے اوصاف موجود ہوں اور بعد ازیں تربیت کے ذریعے ان میں موجود خامیوں کا ازالہ کیا جائے۔

4۔ سماجی تشکیل نو کے لئے اجتماعی نظم کی اہمیت:

سماجی تبدیلی واصلاح کے عمل کے لئے اجتماعیت اور تنظیم کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے کیونکہ عالم اسباب میں کوئی اجتماعی تبدیلی فرد واحد نہیں لا سکتا حتیٰ کہ رسول کو بھی حصول نتائج کے لئے اجتماعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

(الف) یا ایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین (9)

(ب) لکن الرسول والذین آمنوا معه جاهدوا باموالهم وانفسهم (10)

انقلابی اجتماعیت رفقاء کار پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو ہم خیال پا کر اجتماعی طور پر کام کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور یوں ایک اجتماعیت وجود میں آ جاتی ہے، اس کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں بنیادی اہمیت اس امر کو حاصل ہوتی ہے کہ ایک واضح نصب العین پیش کر کے فیصلہ کرایا جائے اور پھر اسے قبول کر کے چل نکلنے والے ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں۔ یہ رفقاء جانتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں رکھتے اور فکر کو عمل میں لانے کے جذبے کے لحاظ سے ہم سب برابر ہیں جب کہ دوسرے مرحلے میں نصب العین کو ساتھیوں کے ذہنوں کی گہرائی تک پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کر لیں کہ وہ اس پر قربان ہو سکتے ہیں اور اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت گذشتہ سطور میں آ چکی ہے کہ رسول اکرم ﷺ مشرق ومغرب کی ظلم پیشہ طاقتوں کے خلاف تبدیلی برپا کرنا چاہتے تھے لیکن مجموعی طور پر عربوں کی علمی اور طبعی ترقی ایسی نہیں تھی کہ ان میں سے قیصر وکسریٰ کے مقابلے کے لئے لشکر تیار ہو سکے۔ ادھر عرب کی تنظیمی قابلیت وصلاحیت صرف قریش میں تھی۔ اگر قریش حنفی ملت کو قائم کرنے کے اٹھ کھڑے ہوتے جو ان کے ذہنوں کے بہت نزدیک تھی تو انقلاب آسان ہو جاتا لیکن قریش کا بالائی اور دولتمند طبقہ طبعا قیصر وکسریٰ کی طرف مائل تھا اور انہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ ان کے ممالک کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ لہٰذا رسول اکرم ﷺ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کریں جو قریش کے رجعت پسندوں پر غالب آ جائے اور پھر عرب کے انقلابیوں کو ساتھ ملا کر مشرق ومغرب میں انقلاب کی لہر دوڑائیں۔ (11)

یہاں جماعت سے مقصود یہ ہے کہ چند ہم فکر باشعور افراد اپنے فکر کے مطابق عمل کرنے پر جمع ہو جاتے ہیں، ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی، وہ اپنے نصب العین کو جانتے ہیں اور اس کی خاطر ہر خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں وہ ایک جسم کی مانند کام کرتے ہیں۔ ان میں فکری وحدت ہوتی ہے اس لئے دشمن کا پروپیگنڈہ ان کو گمراہ نہیں کر سکتا پھر فکری وحدت کے نتیجے میں ان میں عملی وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے نفع ونقصان کو مشترک سمجھتے ہیں اس لئے دشمن کا اقتصادی حملہ بھی انہیں منتشر نہیں کر سکتا۔ (12)

5۔ سماجی تشکیل نو کے لئے تربیت کی ضرورت:

اسلام میں اجتماعیت کا قیام، انسانی نفوس کی تبدیلی میں مضمر ہے، انسانی نفس کی تبدیلی لباس یا روپ کی تبدیلی کے مانند نہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان افکار و نظریات، عقائد و احساسات، مقاصد و طریق کار اور عادات و معمولات یکسر تبدیل ہو جائیں، اسی کو تربیت کہتے ہیں جس میں درج ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ا۔ شعوری بیداری:

تربیت کا تعلیم کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے لہٰذا اجتماعی تبدیلی کی داعی اجتماعیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کو وسعت دے کیونکہ انسانیت کے شرف وفضیلت کا معیار ہی علم ہے جس کی بدولت انسان مسجود ملائکہ قرار پایا اور خلافت ارضی کا حقدار ہوا۔ علم برائے علم مقصود نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ہر نئی بات کو حکمت وشعور کے میزان میں تول کر اسے قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کیا جائے۔ پروپیگنڈہ کے زیر اثر کسی چیز کو قبول کرنا اور اس کی اشاعت کرنا اپنی شخصیت کو بے اعتبار بنانے کے مترادف ہے لہٰذا معلومات کا تنقیدی جائزہ اور حالات کا معروضی مطالعہ، تربیت کا ایک لازمی تقاضہ ہے جو قرآن حکیم کی ذکر کردہ ''بصیرت'' اور حدیث نبویؐ کی بیان کردہ ''فراست مومن'' کا ایک اہم جزو ہے۔

۲۔ تعلق باللہ اور اس کے معاشرتی تقاضوں سے آگہی:

اجتماعی تبدیلی کے لئے مستعد اجتماعیت کا ذات الٰہی سے گہرا اور شعوری تعلق بھی تربیت کے لوازمات میں سے ایک ہے، کوئی تحریک حقیقی معنوں میں جامع اور صحیح معنوں میں انقلابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کا تعلق تجلی الٰہی سے ہو، اسی صورت میں وہ انسان کی اقتصادی اور علمی یا بالفاظ دیگر بہیمی اور ملکوتی وروحانی تقاضوں کی تکمیل کر سکتی ہے کیونکہ انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے بہیمیت یعنی حیوانیت اور مَلَکِیت یعنی عقلیت کا مجموعہ ہے اور مَلَکِیت کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ جب یہ تجلی الٰہی انسانی ذہن میں راسخ ہو جائے گی تو ہر آن اس کی یاد رہے گی اور وہ زبان سے بھی ذکر کرے گا جو درحقیقت اس اندرونی یاد کا عنوان ہوگا۔ (13) جس کے نتیجے میں یہ عقیدہ مستحکم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بزرگ و برتر ہے اور کائنات وانسانیت کے لئے منبع قانون ہے لہٰذا اگر آباء و اجداد، مرشدین و اساتذہ اور حکمرانوں کا حکم، حکم خداوندی کے مطابق ہے تو سر تسلیم خم اور اگر حکم الٰہی کے خلاف ہے تو لائق التفات نہیں، حکمت ولی اللٰہی میں اسے اخبات کہتے ہیں۔ (14)

اللہ سے تعلق، انسان کے اندر شجاعت و جرأت، جاں نثاری اور مالی قربانی کے جذبات بیدار کرتا ہے جس

کے نتیجہ میں انسان، پروپیگنڈے نیز معاشرے کی ملامت سے بے پرواہ ہوجاتا ہے اور عمل جہاد اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے پھر وہ معاشرے میں انقلابی عمل کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ حتی الامکان شرعی احکامات پر عمل کرنے کے لئے بھی مستعد رہتا ہے۔

تعلق باللہ کا ایک خارجی مظہر یہ ہے کہ انقلابی تحریک مادی اسباب سے کام لینا ضروری تو قرار دیتی ہے لیکن ان اسباب کو کامیابی کا کفیل نہیں سمجھتی بلکہ خدائے وحدہ لاشریک کو اس ساری کائنات کا خالق اور مالک مان کر اس پر اور صرف اس پر بھروسہ کرتی ہے۔ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کے عملی نتائج یہ نکلیں گے۔

(الف) قرآنی انقلاب کے کارکن اپنے لئے مادی نفع جوئی نہیں کریں گے، یعنی انقلاب برپا کر کے وہ اپنی ذات کے لئے کوئی مادی فوائد حاصل نہیں کریں گے بلکہ ان سے بالاتر رہ کر صرف رفاہ عام کے لئے کام کریں گے۔

(ب) یقیناً وہ دستیاب مادی اسباب سے کام لیں گے لیکن اپنے آپ کو ان کے ساتھ اس طرح وابستہ نہیں کرلیں گے کہ جب تک مکمل اسباب حاصل نہ ہوں، وہ کوئی کام ہی نہ کریں بلکہ خدا پر بھروسہ رکھ کر کام شروع کردیں گے اور یقین رکھیں گے کہ جوں جوں ضرورت پڑتی جائے گی، خداوند تعالیٰ ان کے لئے اسباب پیدا کرتا رہے گا۔

اس تعلیم کے پیش نظر رسول اکرم ﷺ نے اپنے رفقاء کو سکھایا کہ اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو(15) یعنی تمام اسباب کو مان کر اور بھرپور استعمال کر کے بھی ان سے بے تعلق رہو اور کامیابی کا انحصار ان مادی ذرائع کی بجائے ان کی اصل یعنی ذرائع ساز پر رکھو۔

۳۔ خواہشات نفس پر غلبہ:

تربیت کا ایک لازمی تقاضہ یہ بھی ہے کہ افراد اپنے آپ کو باطنی طور پر مضبوط اور طاقتور بنائیں، یعنی اپنے آپ کو نفسانی خواہشات کے ہالہ سے آزاد کر کے اس بلند تر ذہنی سطح تک لے آئیں جہاں طمع و لالچ، غصہ و نفرت، جاہ طلبی، ریاکاری و تصنع، جاہ طلبی و تکبر، مصلحت پسندی، حیلہ سازی، ذاتی اغراض کی غلامی اس کے آڑے نہیں آتی اور وہ بہر نوع قوت تسخیر کی حامل ہوجاتی ہے اور ہر آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ انسان کے اندر یہ حقیقی اور مستقل کردار صرف آخرت پر گہرے یقین سے ہی پیدا ہوسکتا ہے کیونکہ عقیدہ آخرت آدمی سے لاپرواہی اور بے راہروی کا مزاج چھین لیتا ہے اور اس کو پابند اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے اسی لئے قرآن و حدیث میں اس عقیدہ کو اساسی حیثیت دی گئی ہے۔

۴۔ صبر اور عدم تشدد:

سماجی تشکیل نو نہایت درجہ مشکل عمل ہے، اس سے ہمیشہ شدید مخالفتوں اور سنگین مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خصوصاً ان عناصر کی طرف سے جن کے مفادات تبدیلی کے عمل سے خطرے میں ہوں، اس بنا پر صحت مند تبدیلی کے لئے کوشاں اجتماعیت کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے اور اشتعال میں نہ آئے۔ صبر کی اصطلاح اسلام میں کافی وسعت کی حامل ہے تاہم اس کے دو پہلوؤں کا تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔

(الف) اسلام کے علمبردار چونکہ ہر حال میں اخلاقی حدود کے پابند اور دوسرے لوگ اس قسم کی بندشوں سے آزاد ہیں اس لئے ممکن ہے کہ یہ بات انقلاب حق کے لئے کوشاں جماعت کو اس حد تک متاثر کر جائے کہ وہ اسلامی طریق کار کو ہلکا سمجھنے لگے اور اس کے دل میں یہ خیال پرورش پانے لگے کہ اسے بھی وہی طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو دوسرے لوگ اختیار کر رہے ہیں اس موقع پر ''صبر'' اس بات سے روکتا ہے کہ وہ اپنے طریق عمل کو ہلکا اور بے اثر سمجھنے لگے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے فاصبر ان وعد اللہ حق ولا یستخفنک الذین لا یوقنون(16) ''اے نبی! صبر کیجئے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یقین نہ رکھنے والے آپ کو سبک نہ کریں''۔

(ب) مخالفین کی ایذارسانی پر مکمل برداشت کا مظاہرہ کیا جائے جیسے آیت قرآنی ہے ولنصبرن علی ما آذیتمونا(17) ''انبیاء نے کہا ہم یقیناً ان ایذاؤں پر صبر کریں گے جو تم ہم کو دیتے ہو''۔

مصائب درحقیقت داعی کی سنجیدگی کا امتحان ہوتے ہیں اور کسی کے لئے اس کی دعوت اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہے جب وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر سنجیدہ ثابت کر دے، جوابی کارروائیوں پر گھبرا اٹھنا یا جزع فزع کرنا دعوت میں غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔

صبر کا تقاضہ یہ ہے کہ خارجی امکانات وحقائق کا بے لاگ جائزہ لے کر اس کے مطابق گہری منصوبہ بندی کی جائے۔ صبر سے انسان کے اندر سفلی جذبات اور سطحی محرکات کی جگہ عقل جیسی ربانی قوت اپنا عمل کرنے کے لئے بیدار ہو جاتی ہے جو کہ ایک حیرت انگیز قوت ہے۔(18)

صبر (اور عدم تشدد) درحقیقت اس کا نام نہیں کہ کوئی لڑنے نہ آئے تو آپ نہ لڑیں، صبر یہ ہے کہ لوگ لڑنے آئیں پھر بھی آپ ان سے نہ لڑیں، لوگ آپ کو اشتعال دلائیں مگر آپ مشتعل نہ ہوں۔ لوگ آپ کے خلاف سازشیں کریں مگر آپ اپنی خاموش تدبیروں سے انہیں ناکام بنا دیں، لوگ آپ کے خلاف اپنے دلوں دشمنی لئے ہوئے ہوں تب بھی آپ ان کی دشمنی کو عمل میں نہ آنے دیں۔

جولوگ مشتعل ہوکرلڑنا جانیں اور خاموش ہوکر تیاری کرنا نہ جانیں، ان کے یہاں صرف بربادی کا انجام ہے۔ناممکن ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب ہوسکیں۔کیسی عجیب بات ہے کہ کامیابی پیغمبر ﷺ نے نہ ٹکرانے کی پالیسی اختیار کرکے حاصل کی، اس کو ہم آج ٹکرانے کا طریقہ اختیار کرکے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔(19)

۵۔ نظم وضبط کی پابندی:

اجتماعی تبدیلی کے لئے کوشاں جماعت، نظم وضبط کی تیاری کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی اور جتنا بڑا انقلاب ہوگا اتنے ہی زبردست نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے اور جو جماعت بہت سخت نظم وضبط کی مالک ہوتی ہے وہ صلح اور جنگ میں اپنی مرکزی جماعت کے فیصلے کی پوری پوری فرمانبرداری کرتی ہے، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جو جماعت پیدا کی، اس نے جنگ میں نظم وضبط کا مظاہرہ کئی بار کیا جب کہ صلح میں ضبط کے بہترین مظاہرے کا موقع حدیبیہ میں پیش آیا جب آپ کی جماعت نے صلح کی جزئیات کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کو صرف اس لئے مان لیا کہ وہ ایک زبردست نظم وضبط میں منسلک تھے، اس ضبط کی انتہاء یہ تھی کہ جب آپ نے اس جماعت سے موت پر بیعت لینا چاہی تو ہر شخص نے ٹھنڈے دل کے ساتھ یہ سمجھ کر بیعت کی کہ یہ موت یقینی ہے اور جو شخص بھی اس وعدے کو توڑے گا، اسے ضبط توڑنے کی بڑی سے بڑی سزا بھی مل سکتی ہے۔(20)

نظم وضبط کا ہی تقاضہ ہے کہ اختلاف کی صورت میں ساری ذمہ داری اپنے سر لے کر مسئلہ کو یک طرفہ طور پر ختم کردیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب اس کے افراد میں اتنی بلندی ہو کہ وہ حقوق کی بحث میں الجھے بغیر اپنے اوپر ذمہ داری لینے کی جرأت رکھتے ہوں جہاں یہ مزاج نہ ہو وہاں صرف آپس کا اختلاف ہی پرورش پاسکتا ہے۔جیسا کہ ذات السلاسل کی جنگ (8 ہجری) کے موقع پر جب یکے بعد دیگرے دو فوجی دستے حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ کی قیادت میں بھیجے گئے تو دونوں کی مشترکہ قیادت کے مسئلے پر لشکر میں اختلاف رونما ہوا جو حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف سے قیادت سے دستبرداری کے فیصلے سے ختم ہوا۔(21)

۶۔ استقامت اور بے لوث قربانی:

جولوگ اجتماعی تبدیلی کے اعلیٰ نصب العین کو دل وجان سے تسلیم کرلیتے ہیں تو ان کے گھر کے عزیز واقارب تک دشمن ہوجاتے ہیں، محلے والے، گاؤں اور شہر والے حتیٰ کہ سارا ملک دشمن ہوجاتا ہے اور اگر ملک میں کوئی حکومت

ہوتو وہ بھی ان کی دشمن بن جاتی ہے، ان لوگوں کو اپنے نصب العین میں کامیابی کے لئے ان سب کی مجموعی دشمنی کا مقابل کرنا پڑتا ہے۔ اگر انقلابی کارکن یہ سب کچھ سمجھ کر محسوس کرلیں کہ ان کا نصب العین اتنا دلچسپ اور بلند ہے کہ وہ اس کے لئے ان سب عداوتوں اور مصیبتوں کو برداشت کر سکیں گے اور اپنے نصب العین پر اپنی جان، اپنے بیوی بچے، اپنے عزیز واقارب اور اپنا تمام مال ومتاع غرضیکہ سب کچھ قربان کردیں گے تو ان کا کام آسان ہوجاتا ہے۔

اس راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں مخالف حکومت کا ہونا ہے لیکن وہ کیا کرسکتی ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ دنیا کی زندگی چھین لے گی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر آنے والے مصری جادوگر جب حضرت موسیٰ ؑ پر ایمان لے آئے تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ قالوالن نؤثرک علی ما جاء نا من البینت والذی فطرنا فاقض ما انت قاض انما تقضی ھذہ الحیوۃ الدنیا(22) ''اے فرعون! یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم تجھے ان دلائل و براہن کے مقابلہ میں جو ہم سمجھ چکے ہیں، ترجیح دینے لگیں اور تجھے اس ذات واحد سے بالاتر سمجھنے لگیں جس نے ہمیں پیدا کیا، تو جو کچھ کرسکتا ہے کر گزر (اور حقیقت میں تو کچھ کر ہی نہیں سکتا) زیادہ سے زیادہ یہ کہ تو ہماری اس چندروزہ دنیاوی زندگی کے متعلق کچھ کر سکتا ہے''۔

گویا بنیادی تبدیلی کے عمل کے لئے ضروری ہے کہ ذہن بالکل واضح اور دل بالکل مطمئن ہو، اپنے نظریات پر پختہ ایمان ہو اور اس کے لئے مال وجان اور اولاد کی قربانی پر تیار ہو، چنانچہ رسول اکرم ﷺ کو جب سب سے زیادہ دولت مند بنانے، بادشاہ بنانے اور دیگر پرکشش مادی ترغیبات دی گئیں تو آپ نے سب کو مسترد کردیا اور اپنے چچا سے کہا کہ بخدا! اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تاکہ میں اس معاملہ سے کنارہ کش ہوجاؤں تو بھی میں اس سے دست کش نہیں ہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے غالب کردے یا میں جان سے چلا جاؤں۔ (23) اور یہی وہ استقامت تھی جس نے آپ کی اپنے ساتھیوں میں قدرومنزلت اور احترام نیز مخالفین کے دلوں میں مرعوبیت پیدا کی۔ گویا آپ کا طریق عمل اپنے ہم منصب دیگر رسولوں کی مانند تھا جو کہتے تھے کہ فان تولیتم فما سالتکم من اجران اجری الا علی اللہ وامرت ان اکون من المسلمین (24) ''اگر تم لوگوں نے اعراض کیا ہے تو میں نے تو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوجاؤں''۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لا اسالکم علیہ مالا ان اجری الا علی اللہ (25) ''اے میری قوم! میں تم سے مال کا طالب نہیں ہوں میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے''۔ اسی طرح قرآن حکیم میں ایک مرد صالح کے ذریعہ اس جانب رہنمائی کی گئی اتبعوا من لا یسئلکم اجرا وھم مھتدون (26) ''ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی اجرت نہیں طلب

کرتے اور وہ ہدایت یافتہ اور رہنمائی کے لائق ہیں''۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی تبدیلی مؤثر ہوتی ہے جس کے پیچھے کوئی ذاتی طمع اور انفرادی مفاد نہ ہو، رسول اکرم ﷺ نے تو اس مشن کی راہ میں نہ صرف اپنا وقت اور اپنے جسم و دماغ کی ساری طاقت لگادی بلکہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس کی راہ میں قربان کر دیا، واضح رہے کہ نبوت سے قبل مکہ مکرمہ کی ایک دولت مند خاتون سے نکاح کے بعد آپ کافی مالدار ہو گئے تھے چنانچہ نبوت کے ابتدائی دور میں جب سرداران مکہ نے عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا تو وہ آپ کے پاس آ کر از خود مرعوب ہو گیا اور گھر نشین ہو گیا، اس پر ابوجہل نے اسے آپ کی مہمان نوازی اور مالی حیثیت سے متاثر ہونے کے طعنہ دیا، اسی طرح ایک مرتبہ ولید بن مغیرہ آپ کے پاس آیا اور قرآن حکیم سن کر شدید متاثر ہوا اس پر ابوجہل نے اس کو بھی آپ کی مالی حیثیت سے مرعوب ہونے کا طعنہ دیا۔ گویا اس قسم کی مالی حیثیت سے آپ نے دعوت کا آغاز کیا مگر جب تیرہویں برس آپ نے مدینہ ہجرت کی تو آپ کے پاس کچھ نہ تھا حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ سے قرض لے کر سامان سفر درست کیا۔(27)

آپ کی تیار کردہ جماعت کے اندر بھی قربانی کا یہی بے لوث جذبہ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انصار جنہوں نے اسلام کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں اور اسلام کے بے یار و مددگار قافلہ کو اس وقت پناہ دی جب کہ انہیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، اس کے باوجود (رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد) اس فیصلہ پر راضی ہو گئے کہ اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو اور خلیفہ صرف قریش میں سے منتخب کیا جائے، اس میں شک نہیں کہ اس کے پیچھے بہت گہری (اور معروضی) مصلحت تھی کہ قریش سینکڑوں سال سے عرب کے قائد بنے ہوئے تھے، ایسی حالت میں اگر کسی غیر قریشی کو خلیفہ مقرر کیا جاتا تو اس کے لئے اجتماعی نظم سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ انصار کی حقیقت پسندی تھی کہ انہوں نے اپنی اس کمی کو جانا اور یک طرفہ فیصلہ پر راضی ہو گئے تاہم یہ حقیقت پسندی کی اتنی نایاب قسم ہے کہ اس کی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔(28)

الحاصل اجتماعی تبدیلی اور سماجی اصلاح کے لئے کوشاں افراد اسی صورت میں اعلیٰ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں جب ان کے دل میں نہ صرف جب اقتدار کے جذبات موجود نہ ہوں بلکہ وہ اجتماعی تبدیلی کے تقاضوں کا گہرا شعور اور اس پر عملدرآمد کی صلاحیت کے حامل ہوں۔

6۔ سماجی تشکیل نو کے لئے قیادت کی ناگزیریت:

قرآنی سیاست کے مطابق سماجی تشکیل نو کے لئے قوت رہنمائی ان لوگوں میں مرکوز ہوتی ہے جو قرآن سب

سے زیادہ جانتے ہیں اور سابقین اولین یعنی رسول اکرم ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ جماعت اپنے امور کے انتظام وانصرام کے لئے اپنے میں سے ایک شخص کو بڑا مان لیتی ہے اور اسے اپنا امیر قرار دے لیتی ہے، یہ امیر ان میں قانون الٰہی کے تحت انتظام کرتا ہے لیکن انتظام کی تمام طاقت حقیقت میں خود اس جماعت کے پاس رہتی ہے۔ امیر ان کے مشورے ہی سے کام کرتا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ہے: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (29) (ان سے تمام معاملات میں مشورہ کریں اور جب آپ (اس مشورے کے مطابق) پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کریں۔) دوسرے مقام پر ارشاد ہے وامرھم شوری بینھم (30) (مسلمان اپنے تمام معاملات میں باہمی مشورے سے کام کرتے ہیں۔) چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے ہر اہم معاملہ میں اپنی جماعت سے مشورہ کیا اور کئی ایک مواقع پر اپنی رائے پر دوسروں کی رائے کو ترجیح دی۔ (31)

الغرض سماج میں مکمل تبدیلی کے عمل کی رہنمائی کے لئے باصلاحیت قیادت کا ہونا ناگزیر ہے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ کو بھی چالیس سال کی عمر میں اس وقت ذمہ داری سونپی گئی جب آپ کی عمدہ شہرت چار سو پھیل چکی تھی اور آپ کی بصیرت ومعاملہ فہمی، امانت وراست گوئی اور حسن خلق کا چرچا تھا اور آپ نے گلہ بانی اور تجارت جیسے معاشرتی ومعاشی امور کا تجربہ حاصل کرلیا تھا۔ ذیل میں اہم مراحل کا ذکر ہے جن کے ذریعے آپ میں رسالت کی ذمہ داری کے لئے عملی رسوخ پیدا کیا گیا اور قیادت کی صلاحیت کو جلا بخشا گیا۔ (32)

ا۔ انتظامی مہارت:

رسول اکرم ﷺ نے اپنی نوجوانی کی عمر میں بکریوں کی دیکھ بھال کی، چنانچہ آپ بکریاں لے کر چراگاہ کی طرف نکل جاتے اور طبعی ماحول میں زندگی گزارتے۔ اس دوران آپ کی نظر اللہ کے تخلیق کردہ عجائبات پر پڑتی جن میں کسی انسانی ہاتھ کا عمل دخل نہیں تھا۔ آپ پورا دن بکریوں کے ساتھ رہتے اور اس دوران جو بکری ریوڑ سے علیحدہ ہو جاتی، اسے ریوڑ میں واپس کرتے، اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے اور اسے ظلم پیشہ بھیڑیئے سے بچاتے نیز بکریوں کو خشک زمین اور بیابان جگہوں سے زرخیز مقامات کی جانب لے جاتے غرض یہ کہ آپ کا طرز عمل ایک ہمدرد اور نیکوکار ماہر قائد کی مانند ہوتا۔

۲۔ تدبر وتفکر:

بعثت سے چند سال قبل آپ کو خلوت نشینی بھلی معلوم ہونے لگی، چنانچہ آپ غار حرا کی جانب نکل جاتے یہاں خلوت نشین ہو کر اپنے آپ کو فاسد معاشرے کے اندر پیدا ہونے والے امراض جیسے کینہ، حسد، بغض اور کھوٹ

سے دور رکھتے، بت پرستی کے گلا گھونٹ دینے والے ماحول سے علیحدہ رہ کر اپنی روحانی پاکیزگی حاصل کرتے اور اس شہری فضاء سے پرہیز کرتے جہاں کمزور پسماندہ افراد پر اقتدار کے نشے میں چور لوگوں کا تسلط تھا۔

یہ خلوت نشینی اس حوالہ سے آپ کے لئے ضروری تھی کہ آپ نے مستقبل میں قیادت سنبھالنی تھی، اختیارت آپ کے پاس آنے والے تھے اور آپ کی ہر بات فیصلہ کن بننے والی تھی، لہٰذا یہ لازمی تقاضہ تھا کہ آپ کا دل معاشرہ میں موجود ہر قسم کے حسد، کینہ اور کھوٹ کے گرد وغبار سے بالکل صاف رہے تا کہ آغاز ہی سے انسانیت کے لئے رحمت ورافت کا پیکر ثابت ہوں اور اپنی عوام سے تشدد وطاقت کی بجائے ہمدردی اور نرم خوئی سے معاملات طے کریں۔

۳۔ کاروباری تجربہ:

بعثت سے قبل کئی سال رسول اکرم ﷺ تجارت میں مشغول رہے جس سے آپ کو لوگوں کے ساتھ لین دین کے سلسلے میں کافی تجربہ حاصل ہوا اور آپ کی امانت، سچائی اور اخلاص جیسی صفات معاشرہ پر آشکارا ہوئیں اس پر مستزاد یہ کہ تجارت میں نفع کی صورت میں آپ کی کاروباری مہارت بھی نمایاں ہوئی۔

آپ نے بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ شام کا سفر کیا پھر حضرت خدیجہ کے کاروبار کے سلسلے میں دوبارہ شام جانا ہوا جب کہ آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ آپ وہاں کچھ عرصہ رہے جس سے آپ کے مشاہدات میں اضافہ ہوا۔ ذہنی افق کو عملی وسعت ملی، ممالک کے حالات سے آگاہی ہوئی اور وہاں کے لوگوں کی اہل مکہ کے عادات واطوار سے مختلف عادات کا مشاہدہ کیا۔ یہ تعارف وآگاہی ایک ناگزیر ضرورت تھی کیونکہ آپ صرف اہل حجاز کے رسول اور لیڈر ہی بننے والے نہیں تھے بلکہ تمام انسانیت کے رسول اور قائد ہونے والے تھے۔

۴۔ خود اعتمادی:

جب بعثت کا وقت قریب آیا اور آپ کو فریضہ رسالت اور منصب قیادت سونپا جانے لگا تو آپ کو سچے خواب آنے لگے کہ آپ کوئی بھی خواب دیکھتے، اس کی تعبیر صبح صادق کی مانند واضح ہو جاتی، ان سچے خوابوں سے آپ کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا بالخصوص اس دور میں جب کہ لوگوں کی زندگی اور عام معمولات تک میں خوابوں کا ایک اہم کردار تھا۔

۵۔ خدمت انسانیت:

چونکہ آپ نے دکھی انسانیت کا سہارا اور جہانوں کے لئے پیکر رحمت بننا تھا، اس لئے آپ قبل از بعثت ہی

انسانی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم عمل رہے چنانچہ غار حرا میں آپ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ متفکر حالت میں گھر واپس آئے اور اپنی جان کے بارے میں اندیشہ ظاہر کرنے لگے تو حضرت خدیجہؓ نے جن الفاظ میں آپ کو تسلی دی اس سے آپ کے کمزوروں اور مستضعفین کے ساتھ گہرے تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ آپ کی شریک حیات نے فرمایا ''ہرگز نہیں، بخدا اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بے روزگاروں کو کمانے لائق بناتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔ (33) گویا آپ ان صفات کی بدولت مستقبل کی قیادت کے لئے موزوں اور رسالت کے اہل ہیں لہٰذا آپ کو کسی اندیشے کی ضرورت نہیں۔

بعد ازیں بین الاقوامی انقلاب کے لئے ضروری تھا کہ رسول اکرم ﷺ اپنی قوم کو تعلیم دے کر انقلاب کی لیڈر شپ تیار کریں جو آپ کی جانشین ہو سکے، چنانچہ ان کے لئے شب کے آخری حصہ میں خصوصی تعلیم کا اہتمام کیا گیا (34) کیونکہ دن بھر کی مشقت کے بعد ایسے محنت کش اور نفس کش لوگ ہی خصوصیت کے ساتھ اس وقت جمع ہو سکتے ہیں، جنہیں قرآن حکیم سے خصوصی رغبت ہوگی اور اجتماع و فکر سے روکنے والے امور پر غالب آنے کی قدرت رکھتے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں نفس کشی کی یہ نفسیاتی حالت پیدا ہو جائے گی، وہ قرآن حکیم کا کام پوری ذمہ داری سے کرے گا۔ (35)

7۔ سماجی تشکیل نو کے لئے موزوں طریقہ کار کا تعین:

سماجی تشکیل نو اور اجتماعی تبدیلی رو بہ عمل لانے کے لئے کیا طریقۂ کار ہونا چاہئے؟ اس سوال کے حوالہ سے جب سیرت نبوی ؐ کا جائزہ لیا جائے تو اس پر سیرت نگار متفق نظر آتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے تین سال تک اپنی دعوت کو خفیہ رکھا جس میں آپ اپنے اہل خانہ، اقارب و رشتہ دار اور خصوصی احباب اور ان کو جن میں قبول حق کی استعداد محسوس کرتے دعوت دیتے تھے، گویا دعوت انقلاب کی جدوجہد کے سلسلے میں آپ کے یہاں وہی فطری ترتیب نظر آتی ہے جو کسی نئے ماحول میں ایک داعی کو اختیار کرنی چاہئے، جس کی رو سے ابتداء میں چنیدہ افراد پر کام کرنا ضروری ہے۔

معروف مورخ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں رسول اکرم ﷺ اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ آ گئے تو انہوں نے اس موقع پر اس بابت دریافت کیا آپ نے فرمایا یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے اپنے لئے منتخب کیا اور اس کی تبلیغ کے لئے اپنے رسول بھیجے میں تم

کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تلقین کرتا ہوں اور یہ کہ تم لات اور عزی (مشرکین کے مقدس معبودوں) کو ماننا چھوڑ دو۔ حضرت علی نے کہا میرے لئے بالکل نئی بات ہے جو پہلے سننے میں نہیں آئی اور اس سلسلے میں اپنے والد ابو طالب سے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، آپ نے اس امر کو مناسب نہ سمجھا کہ اعلان نبوت سے قبل یہ راز آشکارا ہو جائے۔ آپ نے فرمایا اے علی اگر تم اسلام نہیں لاتے تو اس معاملہ کو تو پوشیدہ رکھو، حضرت علی رات تک گومگو کی حالت میں رہے یہاں تک کہ اللہ نے ان کے قلب میں اسلام جاگزیں کر دیا اور صبح ہوتے ہی رسول اکرم ﷺ کے پاس آئے، آپ سے کل کی دعوت کے کلمات دہرانے کا تقاضہ کیا۔ آپ نے وہ کلمات دوبارہ بتائے، حضرت علی نے بھی ان کا اقرار کیا، بعدازیں آپ کے پاس چھپ چھپ کر آتے رہے اور کسی پر اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کیا۔

اسی طرح اوس وخزرج کے ابتدائی مسلمان جب موسم حج کے بعد مکہ سے یثرب واپس ہوئے تو آغاز میں ان کا طریقہ بھی یہی تھا کہ محتاط طور پر دعوتی کام کرتے رہے۔(36)

اس مرحلے میں براہ راست انفرادی رابطے ہوتے تھے، اس میں بالمشافہ گفتگو کے ذریعہ سوالات کے جوابات اور اعتراضات کی تشفی کرائی جاتی جس سے بھائی چارہ، باہمی تعاون اور تبلیغ رسالت پر مبنی ایک جماعت کی تشکیل میں مدد ملی۔ جس نے آپ کی دعوت کو عام کرنے میں آپ کا ہاتھ بٹایا یہاں تک کہ سبقت کرنے والے اولین افراد (السابقون الاولون) کی تعداد چالیس سے زائد ہوگئی پھر آپ کو اس بات کا مکلّف بنایا گیا فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین (37) علی الاعلان دعوت دیں اور باطل نظریات پر تنقید کریں، مگر مشرکین سے اعراض برتیں یعنی الجھنے سے بچیں۔

اس کے ساتھ ہی دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا جو دس سال تک مکہ و بیرون مکہ جاری رہا جس میں عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے اعلانیہ دعوت دی گئی اور انفرادی رابطے بھی جاری رہے۔ اسی دوران آپؐ نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر مقامی قبائل کو اسلام کی دعوت دی اور اس کے دنیوی واخروی فلاحی نتائج سے آگاہ کیا۔(38) اسی طرح موسم حج میں آنے والے بیرونی وفود تک اپنی بات پہنچائی نیز اہل طائف اور مدینہ کے قبائل اوس وخزرج تک دعوت کا سلسلہ دراز ہوا۔(39) اس دوران آپؐ کی سب سے بڑی دلیل، جس سے آپؐ مخاطبین کو اپنی رسالت کے لئے قائل کرتے تھے، قرآن حکیم تھا جس نے دنیا کو چیلنج کر رکھا ہے کہ نہ صرف عربی فصاحت و بلاغت بلکہ عالمگیر حقائق ونظریات کے حوالہ سے اس کی کسی سورہ جیسی کوئی سورت بنا کر تو دکھائے۔(40)

نیز آپ نے ارشاد خداوندی کے مطابق کفار کے بیہودہ اور لایعنی سوالات و اعتراضات پر ہمیشہ وسیع الظرفی، صبر وتحمل اور وقار و متانت کا مظاہرہ کیا تاہم اہم اور مفید سوالات کا تسلی بخش جواب بھی دیا، اس کے علاوہ آپ ؐ نے ہمیشہ اپنے مخاطب کے ذہنی اور معاشرتی پس منظر کو مدنظر رکھ کر گفتگو کی جس سے شعوری تبدیلی کے عمل نے ترقی کی۔

8۔ مزاحمت کی جوابی حکمت عملی کے خدوخال:

آپ ؐ کی دعوت کا قریش کے بالائی طبقہ اور سماج دشمن عناصر میں شدید ردعمل ہوا۔ انہوں نے ذہنی اذیت سے جسمانی تکالیف تک کے تمام حربے اختیار کئے۔ ان کی اس مزاحمت کے جواب میں رسول اکرم ﷺ نے درج ذیل طریقے اختیار کئے۔

1۔ آپ ؐ کی ممتاز صفات، اعلیٰ کردار اور باوقار طرز عمل نے دشمنوں کے دلوں تک میں آپ ؐ کا احترام جاگزیں کیا مثلاً امانت، راست گوئی، بہادری، عفو و درگزر، صبر وتحمل، فصاحت و بلاغت، ایفاء عہد، حیا، عدل اور تواضع وغیرہ۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ سے غلبہ اور آخرت میں ابدی کامیابی کا جو سچا وعدہ کیا تھا، آپ ؐ اس سے اپنے مخاطبین کو آگاہ کرتے جس سے صحابہ کے دلوں میں خود اعتمادی کو جلا ملتی جب کہ مخالفین کے حوصلہ پست ہوتے اور آپ ؐ کی قوت ارادی سے ان کی صفوں میں پریشانی بڑھ جاتی۔

3۔ مخالفین کو کھلا چیلنج دیا گیا کہ وہ قرآن حکیم کے کسی حصے کا متبادل پیش کریں مگر اس چیلنج کو باوجود بسیار کوشش کے وہ قبول نہ کر سکے۔

4۔ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی مادی و روحانی تائید آپ ؐ کو اور آپ ؐ کی جماعت کو حاصل رہی۔ مثلاً واقعہ اسراء و معراج جس کے سبب آپ ؐ کی حیثیت محض مصلح یا تاریخی شخصیت کی نہیں رہ جاتی بلکہ رسول کی بالا و برتر حیثیت واضح ہوتی ہے۔

5۔ آپ ؐ اور آپ کی جماعت مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک عدم تشدد پر سختی سے کاربند رہی تا آنکہ مطلوبہ تیاری مکمل ہوگئی۔ یہ اس تیاری ہی کی برکت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد سے سماجی تشکیل نو کی قرآنی تحریک متعدد نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود اب تک زندہ ہے۔

آپ نے اپنی پوری زندگی میں شدت سے اس امر کا اہتمام رکھا کہ کوئی اقدام اس کی مطلوبہ تیاری سے قبل

نہ کیا جائے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ کے ساتھ اڑتیس صحابہؓ جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ سے ''ظہور'' کے لئے اصرار کیا یعنی تبلیغ حق کے لئے اعلانیہ اقدام کیا جائے مگر آپ کا جواب تھا کہ ''اے ابوبکرؓ! ابھی ہم تھوڑے ہیں'' اسی طرح نبوت کے چھٹے سال جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو انہوں نے آپؐ سے کہا ''اے خدا کے رسول ﷺ ہم کیوں اپنے دین کو چھپائیں جب کہ ہم حق پر ہیں اور اس کے برعکس دوسروں کا دین نمایاں ہے حالانکہ وہ باطل پر ہیں''۔ آپؐ نے انہیں بھی یہ جواب دیا ''اے عمرؓ! ابھی ہم تھوڑے ہیں'' آپ کا یہی انداز مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ ہجرت کے بعد جب اسلامی طاقت ایک جگہ منظم اور مرتکز ہو گئی تو اس وقت جوابی مزاحمت کی اجازت دی گئی۔(41) گویا اہل اسلام کے لئے عملی اقدام کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ اس پوزیشن میں آجائیں کہ اپنے اقدام سے اسلام کے لئے نیا اور بہتر مستقبل پیدا کر سکتے ہوں، اس سے پہلے عملی اقدام درست نہیں۔

یہی سبب ہے کہ مکہ میں آپ کو اور آپ کے صحابہؓ کو پیش آنے والے ہولناک واقعات کے باوجود کوئی جوابی اقدام نہیں کیا گیا خواہ حضرت سمیہؓ کی برچھی سے شہادت کا سانحہ ہو۔ حضرت بلالؓ بن رباح، حضرت خبابؓ بن الارت، حضرت مصعب بن عمیرؓ وغیرہ کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا معاملہ ہو۔ اسی طرح آپؐ کے گھر غلاظت پھینکنے کا واقعہ ہو۔ گردن مبارک پر چادر ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش ہو اور سجدے کی حالت میں اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی ڈالنے کے تکلیف دہ لمحات ہوں یا طائف میں پتھروں کی بارش سے لہولہان ہونے اور معاشی و معاشرتی بائیکاٹ جیسے دہلا دینے والے مراحل ہوں، آپ نے نہ صرف خود انتہائی برداشت سے کام لیا بلکہ اپنے صحابہ کو بھی صبر ہی کی تلقین کی حالانکہ بعض صحابہ جیسے عبدالرحمٰن بن عوف، قدامہ بن مظعون، مقداد بن اسود اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ جوابی اقدام کی اجازت ہو لیکن آپؐ نے قبل از وقت اجازت نہیں دی اور اس طرح اپنے صحابہؓ کو تربیت کے مراحل سے گزار کر ایک لڑی میں پروتے اور جماعت سے منسلک کرتے رہے۔(42) اور پھر اس تربیت یافتہ عنصر کے ساتھ یثرت سے آنے والے ایثار شعار متلاشیان حق شامل ہوئے تو سماج کی تشکیل نو کے عملی مرحلہ کے آثار نمودار ہوئے، چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد مواخاۃ و میثاق کے ذریعہ سماج کی تشکیل نو کے عملی اقدامات کی طرف پیش رفت ہوئی، اور ان کی تکمیل کا اعلان حجۃ الوداع (10 ہجری) کے موقع پر ہوا۔

موجودہ زمانہ میں بھی اسلام کے اصولوں اور اقدار کے غلبہ کے لئے ایسی تربیت یافتہ قائدانہ اجتماعیت ہی کی کاوشیں درست سمت میں بروئے کار آسکتی ہیں جو شعوری طور پر گذشتہ ہزار سالہ تاریخ کی وارث ہو، جو اس بات کا

عرفان کامل رکھتی ہو کہ گذشتہ ہزار سالہ دور میں مسلم مفکرین، جدوین، مصلحین اور حکماء وفقہاء وحکام وقضاۃ نے دور کے تقاضوں کو کس طرح سمجھا اور متوازن حکمت عملی اپنائی اور اس ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں خدا نے اسلام کے لئے کیا کیا موافق حالات پیدا کئے اور کن حکمتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں اسلام کے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور جن کا وجود اور اسلام کا غلبہ ثانی دونوں اس طرح ایک ہو جائیں کہ بظاہر ایک کو دوسرے سے جدا نہ کیا جا سکتا ہو ایسی اجتماعیت کے بغیر عالم اسباب میں اسلام کے غلبہ یعنی کامل سماجی تشکیل نو و ہمہ گیر اخلاقی اصلاح کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔

حوالہ جات

1۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی شعور انقلاب، لاہور: مکی دار الکتب، ص125

2۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی جنگ انقلاب (ترتیب شیخ بشیر احمد لدھیانوی)، گوجرانوالہ: مکتبہ حنفیہ اردو بازار، ص 8-10

3۔ سورۃ النساء، 79

4۔ سورۃ الانبیاء، 28

5۔ سورۃ سباء، 28

6۔ سورۃ النور، 55، سورۃ فصلت، 30

7۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی شعور انقلاب، ص45

8۔ وحیدالدین خان، پیغمبر انقلاب، لاہور: امجد اکیڈمی، 1983ء، ص124-122

9۔ سورۃ الانفال، 64

10۔ سورۃ التوبہ، 88

11۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی دستور انقلاب، لاہور: ادارہ نشریات اسلام اردو بازار، ص61

12۔ ایضاً......ص17-16

13۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی دستور انقلاب، ص64

14۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی: قدیمی کتب خانہ، ج1، ص162

15۔ الترمذی، محمد بن عیسی، ابوعیسی، الجامع، کتاب الدعوات، باب لیسأل أحدکم ربه حاجته کلها، امام ترمذی نے حدیث متصل مرفوع کو غریب قرار دیا ہے جبکہ حدیث مرسل کو اس کے مقابلہ میں صحیح قرار دیا ہے۔

16۔ سورۃ الروم، 60

17۔ سورۃ ابراہیم، 12

18۔ وحید الدین خان، پیغمبر انقلاب، ص 111

19۔ ......ایضاً......، ص 60

20۔ عبید اللہ سندھی، مولانا، قرآنی دستور انقلاب، ص 12

21۔ ابن قیم الجوزیہ، محمد، ابوعبداللہ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، کراچی: نفیس اکیڈمی، ج 2، ص 274

22۔ سورۃ طہ، 72

23۔ احمد التاجی، سیرۃ النبی العربی، ج 1، ص 79، بحوالہ سیرۃ ابن ہشام

24۔ سورۃ یونس، 72

25۔ سورۃ ھود، 29

26۔ سورۃ یٰس، 21

27۔ وحید الدین خان، پیغمبر انقلاب، ص 119

28۔ ......ایضاً......، ص 193

29۔ سورۃ آل عمران، آیت 159، امام ابوبکر جصاص رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے لئے ضروری تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں سے ان معاملات میں مشورہ کریں جن میں کوئی صریح حکم موجود نہیں تھا پھر آیت میں عزیمت یعنی پختہ ارادہ کا ذکر مشاورت کے بعد آیا ہے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں وہ عزیمت مراد ہے جو مشاورت سے پیدا ہو (الجصاص، احمد بن علی، ابوبکر الرازی، احکام القرآن، مصر: المطبع البھی، ج 2، ص 50) یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ "عزم" سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا جو لوگ مشورہ دینے کے قابل ہوں، ان سے رائے لے کر ان کی رائے کی پیروی کرنا۔ (ابن کثیر، اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم، بیروت: دارالاندلس للطباعۃ والنشر، ج 2، ص 431)

30۔ سورۃ الشوریٰ، 38

31۔ غزوہ بدر سے قبل لشکر کے پڑاؤ کے سلسلے میں اپنی رائے پر رسول اکرم ﷺ نے حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دی، غزوہ احد میں آپ کی رائے مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے کی تھی لیکن اکثر نوجوان صحابہؓ کی رائے باہر نکل کر جنگ کرنی تھی، چنانچہ آپ نے اسی رائے کو اختیار کر لیا، اسی طرح غزوہ خندق سے قبل آپ بنو قریظہ سے جنگ سے دستبردار ہونے کی صورت میں مدینہ کی ایک تہائی فصل دینے کے معاہدہ کرنے پر غور کر رہے تھے لیکن

انصار کی رائے اس کے خلاف تھی، آپ نے اسے ہی اختیار کرلیا۔(مصطفیٰ السباعی، ڈاکٹر، السیرۃ النبویہ دروس و عبر، صفحات 100, 104, 112)

32۔ ان میں سے بعض مراحل کا ذکر ڈاکٹر قلعہ رواس قلعہ جی نے اپنی کتاب "قراء ہ جدیدہ للسیرہ النبویہ" میں کیا ہے۔(ڈاکٹر محمود سامی القاسم و ڈاکٹر محمد بن عبداللہ البراعی، منہج فی التغیر الاجتماعی، دراسة مقارنة، مجلۃ الدراسات الاسلامیہ، ج24، العدد3، یولیو۔ستمبر 1989ء، اسلام آباد، مجمع البحوث الاسلامیہ، ص 12-15)

33۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابوعبداللہ، امام، صحیح البخاری، باب کیف کان بدأ الوحی

34۔ سورۃ المزمل، 1 تا 4، 20

35۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی دستور انقلاب، ص26

36۔ وحیدالدین خان، پیغمبر انقلاب، ص116

37۔ سورۃ الحجر، 94

38۔ احمد التاجی، سیرۃ النبی العربی، مصر: مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، طبع اول 1398ھ/ 1978ء، ص192

39۔ مصطفیٰ السباعی، ڈاکٹر، السیرۃ النبویہ دروس و عبر، بیروت: دارالقرآن الکریم، طبع اول 1404ھ/ 1984ء، ص82

40۔ سورۃ البقرہ، 23، سورۃ یونس، 27-28

41۔ وحیدالدین خان، پیغمبر انقلاب، ص 116, 117

42۔ سید محمود آلوسی بغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی، ملتان: مکتبہ امدادیہ، ج3، ص 58